

بندی خانوں تک جا پہنچے تھے۔

ہم اپنی کو کیا بتاتے کہ پر دیں کیا ہوتا ہے اور غریب الوفی کیا شے ہے؟
ہم انہیں کیا بتاتے کہ جسی دھری کو، مم اپنا گھر سمجھ کر آئے تھے اسی سرز میں والوں کی فائی
نے ہمارے اندر کیا کیا؟ — ہم اپنے ملک والوں کو کیسے سمجھاتے کہ قحط زدہ علاقوں کی عورتیں کیا
ہوتی ہیں؟ اور کیسے کیا کچھ کڑا رہتی ہیں؟ — ہم انہیں کیا سمجھاتے کہ دشمن کی جیت تکوار
سے زیادہ قلم سے بھی ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ہم کس کس کو سمجھانے جلتے۔
ہم قونہ غازی تھے شہید بھیر ہمارے ملک والے ہماری باتوں کو کیسے ان لیتھتا...
کے لوگوں کی باتیں کون سنتا ہے؟ کون انتبا ہے؟

STATUS QUO

ان کو حرنے والوں نے پھر کس لئے ہماری راہ میں سرخ قالیں پھانے۔

انہیں کس کا انتشار تھا؟

یہ ازالات وہ ہستیار تھے جن سے بھیں دشمن نے خستی کیا۔

انوں نے ہمارے دلیں سے آئے ہوئے ان ازالات سے ہماری مردمی بھیں لی اور ہم سوچتے
رہ گئے کہ پار مل بیٹھنے والوں کو تخفے اور دو ایساں بیٹھنے والوں کو کیا ہم سے اتنی ہی نزٹ تھی۔ ہم
قیدی تھے اور ہمارے جذبات میں رہی سیا خاچو جو بندی خانے میں رہنے والے ذی مدد میں
ہوتا ہے — لیکن وہ لوگ تو لپنے دلن میں تھے۔

ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔

صرف ہماری روح پر دھونی مارک تھے۔

پیغام میں — ایسا من جو بڑے ملک چھوٹے چھوٹے ملکوں کو پیکٹ بند خوبصورت
چھوٹ لگا کر کچھ عرض کیلئے اپناوازن برقرار رکھنے کیلئے دیتے ہیں۔

ڈبلیو فاروار حس — ایسی جگہ جو چھوٹے ملک بڑے ملکوں کے ایجاد پر اپنے ہی ملک کو تباہ
کرنے کیلئے رکھتے ہیں۔

ہم تو پندرہ آف فارتھے — ایسے قیدی جو جگ میں آگاہ ہے اور اس میں قید نہیں۔
ہمارے پاس تو اپنے اور پر ایول کے ازاں تھے۔

وہ ہمیں پوچھتے تھے — منہبے خستہ شدہ لوگ تو بہادر ہوتے ہیں۔ محترم کامو
کیوں ہو؟

ہم انہیں کیا سمجھاتے کہ وہ بھرپور ایمان رکھنے والے اگر دوب بھی جائیں تو بزدل نہیں
کہلاتے!

وہ ہمیں کہتے — مذہبک اساس پر ایمان رکھنے والوں! یہ عمدہ فہریب والوں کا
سارا پول کھول دے گا!

ہم انہیں کیا بتلتے کہ ایمان کی کرنے والیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟
ہم انہیں سمجھا نہیں سکتے تھے کہ گھر کی بنیاد ہلانے والے گھر کے فرد نہیں ہوتے۔ گھر کے سارے
فرداں سے اڑتے جاگرتے ائمے میں لیکن وہ جدا نہیں ہوتے۔ لیکن جب کوئی باہر کا چاہنے والا
سینہ رکلا کہ ابتا ہے تو پھر گھر کے پونچے اڑ جاتے ہیں۔

گھر بیشتر صربانیوں سے لٹتے ہیں۔ نماجتوں سے اجڑتے ہیں۔ ایسی صربانیاں جو گھر کی سمت
کو دیکھ بن کر چاٹ جاتی ہیں۔ ایسی صربانیاں جو ماں سے زیادہ چاہ کر کی جاتی ہیں۔ جب روپی چاہتے
والا گھر کے ایک فرد کی انکو جلا کر اسے وہ سارے مسلم سمجھاتا ہے تو گھر کے دوسرے فروادیں پر کہتے
رہے ہیں۔ وہ ان ساری لڑائیوں کے ڈھکی پی معنی واضح کر دیتے ہے تو گھر کی پہلی اینٹ گرفتہ ہے۔
گھر کی ایک اینٹ بست سے اکھاڑی جاتی ہے۔ ہر چوکاٹ ہر دہیز پر آجوم کر توڑی جاتی
ہے۔ جب باہر کا چلپتے والا انظھوں میں شیر میں گھول کر گھر والوں کے خلاف بھاٹاکتے تو پھر کوئی سمات
باتی نہیں رہتی۔ کیونکہ ہر انسان کرہو ٹھوں میں خود ترسی کاشتکار رہتا ہے جو اس بات کی تصدیق
میں رکا رہتا ہے کہ اس پر مظلوم ہوئے اور اسی لئے وہ غلم کرنے میں بھاگتے ہے۔
ہم اپنوں کو نہ سمجھا سکتے تو ان کو کیا بتلتے کہ ہمارے گھر کی اساس نظر نہ تھی چاہنے والے

غسل تھے۔ ہر پرانی محنت میں پرانے پن کی وجہ سے جو غلطیاں کوتا، سیاں موجود ہوتی ہیں انکو اجات کرنے والے بہت ذہین تھے۔ ہندوستان کی نئی چاہت کے سامنے بنگلہ دشی ہارکیا تا کیا سننا:

اب اگر اپنے اور پر اسکا پتے اپنے ازاں اپس بھی لے لیں تو بھی وہ دھونی اُر کہاں جائیں گے جو ہماری روح پر بھی کے داغوں کی طرح پڑ گئے ہیں۔ وہ سرگوشیاں کہاں جائیں گے جو ہمارے جسم کے اندر ملوکے ہرمولی کیوں میں پھرتی ہیں۔

یہ سرگوشیاں پھلتے ہیتے سیلاں کے پانیوں کی طرح ہمارے دجدو سیاہ راتوں میں جب گھر کا کلاک تین بجاتا ہے، پھر لیتی تھیں۔

اہو میں گھونٹے والی سرگوشی کہتی ہے۔ بیت مندو گوں کیسے آئے اور راستہ بھی ہوئے۔

”کوشا“

”شوکشی کا راستہ — فزار کا راستہ — نبات کا راستہ“

ہم اس سرگوشی کو سنخے پنج کی طرح چیک کر کتے ہیں۔ ”ہم مسلمان ہیں اور مسلمان پر خودی حرام ہے：“

پھر یہ سرگوشی رات کے تین بجے کلاں سے مکاک پر چکتی ہے:

”کیا تمہارا کوئی خدا ہے؟“

ایسا خدا جو بیویوں کے خدا کی طرح ہر ظلم کے بعد ان کے کندھے پر دستِ شست رکھا ہو۔
ایسا کوئی خدا جو صندوک کے بہاکی ماندہ ہر ایسا چار کے بعد ہوں کنڈ جلا کر انہیں کشیر نہ دیتا ہے۔

ایسا کوئی خدا جو عیسایوں کے خدا بیسا بے گناہ ویت نایوں پر بماری کرنے کے لئے دنیا بھر

میں تمہاری سرخوں کا انقلام کر سکے۔

سرگوشیاں انہم — انہم سرگوشیاں!

خیالات پتہ کھانی گیند کی طرح اجرتے رہتے ہیں اور گیس کے موکیوں کی طرح جوں جوں
انہیں ہماری ابتدائی گرمی مل تھے ان کی بڑھتی چلی جاتی
ہے، بڑھتی چلی جاتی ہے۔ بھٹی کر رات کے تین بجے میں اٹھ کر میسر جانا ہوں اور کینڈر کی ٹرف
دیکھ کر سوچنے لگتا ہوں۔

یہ کس کا کم ہے؟

یہ کون سا نکس ہے؟

مشرقی پاکستان — بھارت — کو مغربی پاکستان!

یہ کس کا وطن ہے؟

وہیا تو آبادی کا کہ ان کا دریہ یہ لوٹنے والوں کا؟

میرا کو ازام دھرنے والے صرخ قالمین والوں کا؟

لوگ ہمیشہ کس کا ساتھ دیتے ہیں؟ کس کا؟

پھر دل کے اندر جبل ہونے لگتی ہے۔ خون کے بڑے بڑے فیضم طیارے چکا دڑوں کی
طرح اڑنے لگتے ہیں اور امید کی شفی خنی میرزا ملیں ان کا کچھ نہیں بلکہ ملکتیں۔ ریکاٹل اس مینڈ شکن
تو پہیں فائز کر قی ہیں لیکن دل کے از دگرد کوئی گھلنے دار تاریں پچھائے پلا جاتی ہے۔ پچھائے
چلا جاتا ہے۔ پچھائے پیلا جاتا ہے۔

اسی طرح بالکل ایسی رات کے تین بجے جب صرف ہماری ساش زندہ تھی ہر بہن لکھنے کے
آنسے سے بہت پہلے اسی کے قدم ہماری بیرک کی طرف بڑھتے چلے آئے۔ بڑھتے ہی پلے آئے۔
اس وقت کیشپن فرید کو فرار ہوئے پنا گھنہ ہو چکا تھا لیکن ہم سب اسی طبقے میں زمر
نئے جب وہ چاروں بیرک سے نکلے۔

ہر بہن نے گھستے ہی نغہہ رکایا:
”تم سب چاہتے یا ہو۔“

ہم سب خاموش رہے۔ غاباً عبد الکریم کے سوائے ہم سب پیش اب کرنا پاہتھے تھے۔
سلئے مرا ہر آگاہ دادھ کیلی چادر میں پڑا تھا۔

ہر بیس کھنڈ کے ساتھ ولے سپاہی تازہ تازہ نیند سے جانگے تھے اور ان کی آنکھوں میں
سوائے قلبی کی بجا اوری کے اور کسی قسم کے جذبات نہ تھے۔

ہر بیس کھنڈ بڑی دیر تک چپ چاہم چاہ دل کے چہرے دیکھتا رہا۔ چروہا ہستہ کہتا
بھر پور توجہ کے ساتھ عبد الکریم کے پاس پہنچا۔

عبد الکریم کے چہرے پر سکون تھا۔

اس نے بڑے احترام اور فرماندی کے ساتھ سلیٹ کیا۔

سپاہیوں نے عبد الکریم کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ اس کی جیسیں مرے ہوئے کتوں کیے
زبانوں کی طرح باہر کر لیکر ہی تھیں۔ پھر ان نے سر لئنے تھے سے چند سکے، وو گنگڑیں اور ایک
چیخڑا اٹھا کر کھلی، سیقیلی میں سلئے پیش کر دیا۔

”یہ چیخڑا تم نے کیوں چھپا کر کھا تھا۔“

”یہ رو ماں ہے چیخڑا نہیں۔ ادھر جو ہاگا چاہ پر ایک بنگالی بہن نے ہم کو دیا تھا۔“
سارے فاعل سپاہی ہر بیس کھنڈ سے آتے کر مسکرا دیئے۔ معاملے کی نزاکت سے تحریکی
سی کلفت دور ہوئی۔

یکدم ہر بیس پھر انداشت ہو گیا اور کمزک کرن لے۔ ”جو ہاگا چاہ کا نام لیتے ہوئے شرم نہیں
آتی۔ ہم خوب جلتے ہیں۔“ وہاں اس بنگالی بہن کے ساتھ تم نے کیا کیا ہو گا۔

BEAST

عبد الکریم انگریزی اس قدر نہیں جانتا تھا لیکن پہلی بار اس کی آنکھوں کا اپرچہ بند ہوا

گھو بیا وہ بہت زیادہ روشنی میں آگیا ہو۔

”نمہ سب جلتے تھے کہ ابھ کیپن فرید اور اس کے ساتھی فزار ہوئے ہیں۔“

ہر بیش نے یہ سوال تین مرتبہ دہرا لیا۔
یہ لمحہ قیامت کی طرح مباحثا۔

عبدالکریم کے حوالے ہے ہم تینوں نے لفٹی میں سر ہلایا۔
”تم جانتے ہو عبدالکریم۔“

ایک ثانیہ کیلئے وہ آگے کی طرف بھکا۔ بالکل نامعلوم سا جھکا کا، جیسے کوئی تن اور درخت
شپہ معراج کو سجدہ سے کھلائے بھکا ہو۔ پھر وہ نئی طاقت پا کر ایسا تادہ ہو گیا۔

”جی صریح کو معلوم تھا“ INFRA RED شعاعوں کی طرح تیکا چھو جانے والا
جواب آیا۔

”تم کو معلوم ہے کہ ان کا کیا پروگرام ہے：“

ہر بیش اپنی ایڑیوں پر یوں گھوم گھوم کر بات کر رہا تھا جیسے نینک شکن لپنے ٹرٹ پر
مرٹ نہیں۔

”جانتا ہوں سر۔“

باتی تین سپاہی بھی مکمل طور پر ساکت ہو گئے۔

”تم جانتے ہو وہ کس۔ . . . درائیشن میں گئے ہیں۔ کس طرف۔“

”جی۔ جانتا ہوں۔“

اب ہر بیش نے مجت سے عبدالکریم کے کندھے پر مانور کھا اور بولا: ”ذیکھو بھائی میرے!
ہندوستان اور پاکستان میں کوئی فرق نہیں۔ یہ کچھ لیڈر ٹول کی بے دقوں، نماہی، کم تکمیلی تھی کہ ہم کو
 جدا کر دیا۔ . . . بھائی میرے! ہندوستان پر نظر درٹا دیا۔ تیرہ کروڑ مسلمان سہتے ہیں۔ یہ بھی
تمہارا لئک ہے۔“

عبدالکریم مال سے زیادہ چلنے والے کو خوب پہچانا تھا۔ اس نے آہستے سے کہا: ”اگر عمارا
لیک اچھے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا اور ہم ہاتھ نے کمزور نہ ہوتے تو یہ تیرہ کروڑ مسلمانوں کی زندگی

زندگی لبرکتے۔ اب بے چارے دعویٰ کے گئے کی طرح زندہ ہیں۔“

ہر بنس بدک گیا لیکن شاید اسے نہ مار ہے کامکم مانخا اور اسی ملائم آذان میں بولا:

”جاتی عبدالکریم — الگر تم ہمارے ساتھ سمجھوتے کرو تو ہم تمیں اس بغادت سے معاف دلادیں گے۔“

”سمجھوتہ؟ — کیا سمجھوتہ؟“

ہر بنس کے چہرے پر دعویٰ کی خوشامد تھی۔

پہلا جو پاکستان گیا۔ اس میں تم بھی جائے گے۔“ BATCH

عبدالکریم شرمن مینک کی طرح اپنے بوتوں میں اڑاکھرا تھا۔

”جتنی دیر تک تم قبیدی رہو گے تمہارا راشن دو گناہ رکا۔ تم سے بہت اعلیٰ سلوک کیا جائے گا عبدالکریم۔“

اس کے ہاتھ میں اب بھجدھاری دار چیز ہر دلچسپیا ہوا تھا۔

”تم مرن اتنی بات بتا دو عبدالکریم کرو کہ کس دشائیں گے ہیں۔ اتنا سمجھوتہ کرو ہم سے۔“

”سمجھوتہ — غلام کے ساتھ؟ اپنے اصولوں کے ساتھ غداری؟ مسلمان یا تو معاف کرتا

ہے یا بدله لیتا ہے۔“ سمجھوتہ دغیرہ وہ نہیں جانتا سمجھی۔

عبدالکریم اسکے بعد یوں بول رہا تھا جیسے جتن پڑھے پر کوئی ان پڑھدہ لڑکی عزیزی فارسی بولنے لگتی ہے۔

”یہ تمہارا آخری چانس ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”آخری چانس۔“

اب ہر بنس کھنڈ نا ہاتھ اس کے پستول پر پہنچنے چکا تھا۔

”بدله — یا معافی جناب — سمجھوتہ نہیں۔“

تم سے۔ بد لڑ گے ہم سے۔ ابھی نصیحت نہیں ہوئی تھیں۔ ابھی کوئی سبق نہیں یکھاں تھا۔ قید میں تھا رایہ حال ہے تو رہا ہو کر تم لوگ کیا کیا نہ سوچ گے۔ ہم نے تمہارے ساتھ کوئی خللم نہیں کیا۔ پھر بھی تم ہمارے نہیں بنتے۔

”ابنوں کو چھوڑ کر ہم آپ کے کیسے بن سکتے ہیں میر۔ ہم اپنوں کو کیا منزد کھائیں گے۔“
نہیں بن سکتے تو نہ سی۔ ہم راہ کے پتھر ہٹانا جانتے ہیں۔ ہم تمہیں بھی پاکستان جانے نہیں دیں گے۔

یکبار گئیں خانہ ہوئے۔

وہ منزد کے بل نہیں گرا۔ تن اور درخت کی طرح تیچھے گرا۔ اپنے بستر پر جسم بدلنے کی آزادی اور پھر بیرک میں سناٹا ہو گیا۔

بند دستان کی ساری فوج عبدالکریم کا راستہ روک لگی۔

چھیھڑا عبدالکریم کے ہاتھ سے چوتھ کر ہنس کے قدموں میں جا گرا۔
اسناسا دینا پیش کرنے کے بعد بغیر سمجھوتے کئے عبدالکریم ناہم کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ شاید یہ سرخ قالیں اپنے نے اسی کیسے بچا رکھا تھا۔ دلیں والوں کو ہماں نہیں عبدالکریم کا انتظار تھا۔



اس کی تفصیل میں جانے سے تنقیع اوقات ہونے کا اندازہ ہے۔ میری آرزو ہے کہ کالج سے خصت ہو نیوالے طلباء کیلئے کوئی ایسا WORKABLE خطبہ ہو جائیں اس تفاصیل سے پکارے جس نے نوجوان ذہن کو آج گرفت میں لے لیا ہے۔ انہیں پہنچانے اقدار اپنے کپڑا اور مذہب کی طرف اس طرح پھیرا جائے کہ وہ کالج سے نکل کر اپنے معاشرے کے تحفظ کے نامہ ہوں اور معاشرے کے بغایہ ادھیر نے میں برس ریکارڈر مہینے رہیں۔ رواداری، محبت اور نظریاتی فراخ دی، محنت ایسی خوبیاں ہیں جو استعمال کو جوڑے کا شتیٰ ہیں۔ آپ کو اس ضمن میں راستہ دکھانا آپ کے علمی تجربے نا اضافی ہے۔ میری تو یہ آرزو ہے کہ خطبہ اس تفاصیل کو کم رہے جس سے آج کا نوجوان درجہار ہو رہا ہے۔ اس بھرمان کی بیخ کرنی کرے جس میں آج کا نوجوان غلطان دی یہاں ہے۔“ خطبہ ٹولی تھا اور یوں لگتا تھا جیسے پرنسپل صاحب نے ایک برصغیر ریڈرڈ ڈا جسٹ کامیابی کیا ہو۔ اس کے خدمیں دینی اور اخلاقی اقدار پر کچھ ایسا زدر تھا جیسے گرامر کے پکار یوں کی تحریر میں کوئی اور سمجھی کوئی کنکار ہوا کرتی ہے۔ پانچوں شاطر ہوئے ہوئے کافی مُرُك رہے تھے اور یہ پچ رہا تھا کہ کن الفاظ میں پرنسپل کو انکار کروں کہ اسے پھر کے ملنے کا احساں نہ ہو۔ میرے پاس ایسا کوئی قابل عمل نظر پر موجود نہ تھا جسے میں عورتی دور کے نوجوانوں کے ذہنی بھرمان کو ہفتہ اکر لی کیلئے بطور نذر ادا پیش کر سکتا۔

میرے پاس بھی ہبہ فرد تھا لیکن میں اس مذہب کے استعمال سے فاصلہ بھی تھا۔ میرے پاس بہت سے مشتبہ نظریے تھے اور ہر مشتبہ نظریے کے بطلان کیلئے ان گنت قیادم جاندار اور نظریے موجود تھے۔ میں وطن کی خاطر خان پر کھیل جانے والا پاہی بھی تھا اور وطن پرستی کو انسان دوستی کے منافی بھی سمجھتا تھا۔

میں حدود میں مقید از آدنفاوں کا مستلاشی درندہ تھا۔

میرے لئے ہر گلہ نہ دی جو شاہراہ سے نکلتی بالآخر شاہراہ بن جاتی تھی۔

میرے لئے ہر جوٹ سچا تھا اور ہر پچھوٹا۔

میرے لئے محبت موت بھی تھی اور زندگی بھی۔

میں جو آگ اور پانی کے اقبال سے کچھ یوں پیدا ہوا کہ کسی پوری طرح اُگ بختی تھی نہ کبھی پوری طرح پانی سطح پر تیرتا۔ میں نوبالغ بچوں کو کیا سمجھاتا؟

میں نے انکار کا خط نکھنے کیجیے قلم اٹھایا ہی تھا کہ مسلمانے بیٹھے ہوئے پانچ یہودی ہومن دسوٹاً کھلاتے کھاتے تھک چکے تھے امیرے جواب کے سامنے دیوار بن کر تھے۔ ان پانچ اور میوں کی آنکھیں میں خوشابد کا حضرت تھی جو انکساری اور گیر والابس اور ڈھنے رکھتی ہے اور خاک گز بھی جسے دھندا نہیں سکتی۔

میں نے دل میں سوچا کم از کم میں رُٹکوں سے یہ تو کہ سکون گا کہ بالآخر ہر فلسفہ قیامت پر ختم ہوتا ہے۔ ہر مرحلے کے آگے صبر کی کڑی منزل ملتی ہے اور جب کوئی اُدمی ناگرہ گناہوں کی حرمت کی وادا اس قدر طلب کرنے لگتا ہے کہ اس کا اللہ تقریباً مندہ ہونے لگے تو پھر نعمتوں کی سیر ڈھنی کو جھٹلانے والے کبھی ہر زینہ دیکھ نہ دے بناتا جاتا ہے۔ میں نوبالغ رُٹکوں کی بے چینی میں کم از کم اس طرح شمولیت تو کر سکتا تھا جیسے فصاری پیش کر لیتے ہیں۔ میں شاید اتنی صلاحیت تو رکھتا تھا کہ اگر حدیب نہ بت سکوں تو وہیں کارنیگی کے اصول برداشت کرنے ہی جلا جاؤں۔

یہی عیامت کا جذبہ مجھے کا بچے کی حدود میں لے گیا۔

میکن اس روز جب میں سالانہ کنوکلشن کے جلسے میں پہنچا مجھے معلوم نہ تھا کہ اسی دن مجھے ایک نایت اہم بلیچہ میں خوشیوں کے سیشن پر بھی جانا تھا۔

جب وقت میں کا بچے کی حدود میں پہنچا دوسرو یخوش اعتماد فرست ایم کے نوجوان رُٹکے گاڑڈ آن اُز کی تسلیک میں کھڑتے تھے۔ کچھ ڈنی کپے، سفید سروں والے پروفیسر پیش ہیش تھے۔ ان کی پنچگی شکست برتوں کی طرح بڑی قابل ترس تھی۔ نوجوان پروفیسر جو یا تو سول سو روپی کے خواب دیکھ رہا تھا۔

ہو پچھتے یا جو سول سروی ملنے تک ماں کر دے رہے تھے قدرے ویچپے اور ان ملنے جسے
اگے بڑھتے تھے۔

شکستہ رو بزرگ پر دفیر۔

شانی مستقبل سے ماپوس پر دفیر۔

قطار درقطاس بے چین، مجتسس طالب علمون کا انہوہ۔

پرانی نسل سے بیزار آنولے مستقبل سے خوفزدہ نوجوان۔

ان نوجوان بیٹوں، بجا بخون، بختیوں کے محظوظ مررت۔

اور ان میں بیٹھی ہوئی وہ نوجوان لڑکیاں جو تعلیم حاصل کر کے نتین میں نتیرہ میں ہوئی تھیں
معلوم شری جو اندر سے بہت پتیلے اور سلوک کے برتن کی طرح ہتھ تھے۔

ہال میں یہ سب لوگ جمع تھے اور مجھے ان سے کچھ ایسی جامع، ٹھوس اور بالائیں باشیں زنا تھیں
کہ انہیں کچھ دیر کھینے میر بھول جلتے کہ زندگی بڑی الجیلی ہے اور تقریر کرنے والا کوڑی کی طرح اندر
سے کھو کھلا ہے جس وقت میں صرخِ خلی سے مردھی ہوئی کرسی میں بیٹھا، میں احساں ذمہ داری سے
بچو رکھا۔.... لیکن جس وقت میں نے اپنا ایڈ لیں متروع کیا۔ اسی وقت صائمہ کی سسکیاں میرے
سارے بدن پر لگنے لگیں۔ اس کی لمبی لمبی موی انگلیاں جن پر ہمیشہ نیلے ہریرے کی انگوٹھی رہتی تھیں۔
ان شندی انگلیوں کا مس میری گردن کو اس طرح سملانے لگا کہ سیاہ گاؤں کے اندر بُوڑوں تک میرے
سارے رو بنا کھڑے ہو گئے۔

کاش اللہ تعالیٰ کے پاس بھی دیسی ہی معمولی گھری اسعمال کیلئے ہوتی جو اس دنیا کے لوگ
عام طرز پر کافی سے باندھ سے پھرتے ہیں۔ پھر اس کے اور ہمارے ٹانگ میں نیادہ سے زیادہ اتنا
وقت ہوا مبتلا کرین و پڑھ نامہ سے ومرے ماکس کے وقتوں میں ہوا کرتا ہے لیکن اس کو کیا کچھ کہ
فضلے بزرگ دبر تر کی گھر دی قرن چلتی ہے اور سینہ بناتی ہے اور انسان گھری سینہ چلتی ہے اور
حمدیاں بناتی ہے۔ شاید اسی نے اللہ شاکی ہے کہ اتنی نعمتوں کے باوجود اُدم کی اولاد نا شکری ہے

اور انسان اzel اور ساہنگ پھیلے ہوئے خدا کے سامنے خوفزدہ گھر مبارکہ بدلہ بدلہ کرتا ہے:
 یا باری تعالیٰ ایتے جہاں میں آرزو میں آنحضرت دیر سے کیوں پوری ہوتی ہیں؟
 زندگی کے بازار میں ہر خوشی سمجھ ہو کر کیوں آتی ہے؟ اس کا بھاؤ اسقدر تیز کیوں ہوتا ہے
 کہ ہر خیدار سے خریدنے سے قامر نظر آتا ہے؟ ہر خوشی کی قیمت اتنے ذخیرہ سارے آنزوں سے
 کیوں ادا کرنا پڑتی ہے۔ آفائے دو جہاں؟ میسے کیوں ہوتا ہے کہ جب بالآخر خوشی کا بندُل ہاتھیں
 آتا بھی ہے تو اس بندُل کو دیکھ کر انسان عسوں کرتا ہے و کانمار نے اسے لٹکایا ہے..... جو
 اپنی کی عرضی تجھے تک جاتی ہے اس پر ارجمند لکھا ہوتا ہے اور جو تمہرے فرشتے رکھتا ہے
 ان کے چاروں ہلف صبر کا دائرہ نظر آتا ہے؟ ایسا کیوں بے باری تعالیٰ؟ جس مال گاڑی میں تو انسان
 خوشی کے بندُل روانہ کرتا ہے وہ صدیوں پہلے چلتی ہے اور قرن بعد پہنچتی ہے۔ لوگ اپنے اپنے نام
 کی بخشی نہیں چھڑاتے بلکہ صدیوں پہلے مرکب گئی ہوئی کسی دوسری قوم کی خوشی کی کھیپ یہیں آپس میں
 پاش لیتے ہیں جیسے سیاپ زدگان امدادی فنڈ کے سامنے مخذول گھر ہوں۔ خوشی کو قناعت میں
 بھلنے والے رب سے کوئی گیا کہ؟ جب ابھت اگر نے کبھی انسان کی ایجاد کردہ گھری اپنی کھانے
 پر ہاندھ کر دیکھی ہی نہیں۔

لوگ مشائق نظروں سے میری طرف دیکھتے ہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اسکی خوشی کیش
 پر جو مال گاڑی آنواالی ہے اس میں سے مجھے بھی ایک بلٹی چھڑنے جانلے۔ خدا جانے اس بلٹی پر کس
 کا نام درج ہو گا؟ ماں فاہل کے عہد کا حکم لگا ہو گا کہ معزی بھکھ نظریتی کے زمانے کی ہو گئی۔
 جب پرنسپل سالانہ روپوٹ پڑھ چکا اور میں نے ایک دفعوں کے سامنے جا کر اپنی مانگی گرہ کو
 ہاتھ گایا تو میرے سامنے کالے مردوں کا ایک قالین سا بچا تھا۔ انسانی ذہن کی ایک بلٹی چوڑی سائیکی
 میری منتقل تھی۔ نوجوان مجھ سے اس بات کے طلب کارتھے کہ میں ان کے جوش، دلوںے، امید اور
 بغادت کے رنگوں میں یہی ہوئے پرچم کو ہاتھ میں لوں اور اپنے اپنے کھوں۔ — زندگی زندھ باد
 اشرف الملوکات زندہ باد۔ — بقائے انسانی زندہ باد —

عمر گم کرنا صورت زندگانی را پکار رہے تھے۔ فرشتہ بوث میں سے ہٹے گوئی سے کمرے کے
تھے، دیکھنا اسی باری بہشت کا خدیدہ نہ کرنا..... دیکھنا کسی ریگ بزرگ با غبائل سے مشاہد
نہ کر بیٹھنا..... ہم نے تمیں پیاں اس لئے بلا یا ہے کہ زندگی کو پکڑ جان کر کے انکے سامنے
پیش کر دو۔ پھر یہ جانیں اور ان کی آسمانی پائی۔ دیکھنا ہمیں دغا نہ دینا۔

میں نے ایک بڑی طبقت رلیفی کی طرح ایک نوجوان بازداشتھا بایا اور دوسرا مفروج ہاتھ باند
کر دیا۔ اور اسی وقت میری آدمان صائمہ کی ہمکیوں میں ڈوب گئی۔

عبدالکریم و فون کوٹٹ کرنے والے سے اپنی خرابی سمجھ کر جا چکا تو ایک بار پھر میں نے اپنے
میں ہوت پیدا کی۔ ایک ہاتھ راجا جن کے کندھے پر رکھا۔ دوسرا ہاتھ میں کپل و ستو کے راجہ
و روی و حن کے بیٹے ہمata بدهکی انگلیاں پکڑیں اور تقریر کا آنا فر کر دیا۔

میں جب بھی کسی جلسے اتفاقی یا سینما میں مغلوب ہوتا ہوں اپنے اپنی کاذک ضرور کرتا
ہوں کیونکہ میں جانا ہوں کہ میری ہشری سے شر کے تماہیز دار غب و افتادی۔ سیلف میڈا اُدی
چلے ہے باہر اپنی کی کھال کا بندہ بواز رہ بکتر ہے اس کا اندر جلے ہوئے کافی کی طرح ہوتا ہے اور اس
اندر دل کے پرسے زدہ وجود کو شر دلے اس سے ستر جانتے ہیں۔ میں بھی ہر سیلف میڈا اُدی کی طرح
پیش بندی کے طور پر اپنی نہریت کا ذکر فرود کرنا ہوں۔ پیشہ اس کے کرلوگ کمیں ہمہ نہایت کے منی
کو خوب جانتے ہیں۔ ہم ان مور ٹکھوں کی اصلاحیت سے آکاہ ہیں جنہوں نے تمیں کوئے سے مور بنا
و رکھا ہے۔ ہم اس گھوڑی کے ہر زینتی وجانتے ہیں جس کے قدم لال ہو۔ میں بھی ہر عقلمند سیلف میڈا اُدی
کی طرح بڑے پیاک سعدہ پرانی پوتین لارک سب کے ملنے والی دیتا ہوں اور کہتا ہوں شر کے
نہریت وارو! اس میں پانچ سوراخ ہیں۔ اس کے کاف بوسیدہ اور چاک پیشے ہوئے ہیں۔ اسکے
کار پر جو کچھ گلی ہے اسے میں نے نشانی کے طور پر سہیتہ سا تھوڑا رکھا ہے۔ میری ہر تقریر تھوڑے
سے رذو بدل کے ساتھ تہمیشہ کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

معزز خواتین و حضرات!

میں ایک معولی گارڈ کا بیٹا ہوں۔ لال اور سبز جنڈیاں ہلانے والا معولی گارڈ۔ اسی نے
معے گاڑیوں سے بڑی مناسبت رہی ہے۔ میرے تین بھائی اور چار بیٹیں ہیں۔ یہ سب ٹرین
محبوسے بڑے تھے۔ اسی طرح مجھے دراثت میں غربت تو ملی لیکن محبت کی دولت عالم گھروں سے زیادہ
میرا کامی ہے جو اسے معاشرے میں غربت اور خروجی لازم گردانی جاتی ہیں۔ یہاں غربت انگشت
خانی کا دوسرا درپدھان گئے لیکن میرا تجہیہ بہت مختلف ہے۔
آپ سب کامی سے حفت ہو کر اپنی اپنی راہ پر گامزن ہوں گے۔ کچھ خوش قسمت لگوں کے
لئے دولت کی روپی لپی پری ہمارے منتظر ہوں گے۔ کچھ غربت کے جھوٹے میں برسوں ہکوڑے لیتے
رہیں گے۔ میں آپ سب کیلئے مساوی حالات کی خوشخبری تو نہیں لاسکا لیکن اتنا کے بغیر نہیں رہ
سکوں گا کہ غربت مسئلہ جدو جند کیلئے ایک درستگاہ ہے۔ جس اس طبیعت غربت کے پانوں پر
راہ ہنس کی طرح تیرتی ہے غربت زندگی کا زندہ..... خلوص کا ترازو..... اور انسان کی پرکش کے
لئے بہترین کوشش ہے۔

ہال میں تالیوں کی گونج ہے۔

دلنے کے لائے میں چڑیاں زیر دما آچکی ہیں..... ترقی، خلوص اور پرکش کے چونچاں
رنگوں سے لوگ چند صیلگئے ہیں سب سے خطرناک پیغ وہ ہوتا ہے جس میں جا بجا جھوٹ کی پیغیں گی
ہوں۔

میرا بابا گارڈ تھا۔

یہ بھی درست ہے کہ ہمارے ہاں کھلنے والے زیادہ اور دشمنی کم ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہ سچ
نہیں ہے کہ میں محبت کی دولت سے الال رہا۔ جسموت میں اپنی ہاں کے پیٹ میں تھا وہ پورے
سات پچھے جوں کرچا وہ شلنے چلت ہو چکی تھی۔ اس کے کوئے بیار بھیں کی طرح باہر کو نسلکے ہوئے
تھے اور دونوں گاہوں پر بدشک چھائیاں تسلیوں کی طرح آبیٹھی تھیں۔ راست کے پچھے پورہ خشک
کھانی کھانتے کھانتے اسی زور سے چار پائی کی پیٹیاں کپڑتی کہ بان کا نشان اس کی بخیلیوں پر

جم جاتا۔

ٹایمیرے باب کو میری ماں سے مل پیا تھا؟
ہو سکتا ہے کہ ہر زیرِ بادتی کی طرح میرے باب کی بیوی بھی گھرگستی کی مشین کا خزروی
ترین پر نہ تھی۔

عین نکنہ ہے کہ جتنی تمل کے لئے میرے باب کے پاس اس سے سستا اور کوئی ذریعہ وجود
نہ تھا۔ وجہ کچھ بھی تھی اتنی بات واضح تھی کہ میرا باب میری ماں کی موت کے خوف سے خوفزدہ تھا۔ اگر
میرا باب امیر آدمی ہوتا تو شاید اسی ماں پر کئی اعتراضات بھی ہو سکتے تھے لیکن اس وقت شادی کی گاڑی
دلدل میں پھنسنی تھی اور اس میں جھٹے ہوئے بیلوں میں سے میری ماں کا اندر زیادہ گرتا۔ اسی نئے میرے باب
کی بڑی شدید آرزوں کی کچھ دریا اور میری ماں کا کندھا ہلکانہ کرے۔

ہو سکتا ہے کہ میرے باب کو میری ماں سے راقعی بیمار ہو۔ کبھی کبھی غربت میں اس نعمت اور
آسمش کیجیے و عجب قسم کے سبب پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اپنے باب کی جو سب سے پہلی شفقت میں نہ
وکھی وہ یہ تھی کہ جب میرے اپنی ماں کے رحم میں فدم رکھا اور باب کو اعلاء عہدی تو اس ناگوری
میں نے ماتھا پڑ لیا اور دے اصرار پر اصرار کرنے لگا کہ دافی فضلاں سے مل کر بچہ ضالع کر دیا جائے۔
پہنچ تو دوچار ہفتے ماں رضا مند نہ ہوئی۔ منڈ کڑی ماں سارا دن سوچتی رہتی۔ بے چاری پلنے
خیالات کی عورت تھی۔ اللہ اور رسول کو جیتے جائے انسانوں کی شرگ کے ارڈر ہی کمیں چھپا ہوا
سمجھتی تھی۔ بست قدم کے کمیں دونوں ہی ناراضی نہ ہو جائیں۔ بچپر مجازی خدا کو سارے گناہ اور ثواب
کے اختیارات سونپ کر مندی پڑ گئی۔

خداجنے میری ماں واقعی حکم دل تھی یا صحت خراب ہونے کی وجہ سے اسکی آنکھیں میں ہر رفت
آنسو جملہ تھے پرستے ہیں جس روز اس نے فضلانِ دافی کا بنا ہوا کاڑھا پیا اور کھیس کی گلکار
کر فومبر کی نیم گرم دھوپ میں چار پانچ پریشی اسی روز ماں بست روئی۔ دافی کا کہنا تھا کہ اول
تو کاڑھ سے ہی اندر کی صفائی ہو جائے گی لیکن اگر رحم کامنہ نہ کھلا تو پھر وہ با قاسمہ علاج کریکا

گھاس علاج کے پورے پچاس روپے لگیں گے۔
 خدا جانے اکٹھے پچاس روپوں کا خوف تھا کہ پچھلائے کرنا مان کے اخلاقی ٹوٹ کے خلاف تھا۔ وہ بکچھی تھی۔ ہماری کہ استھان محل کا فاقع تو پیش نہ آیا ہاں مان کو اسی پیشگی کے کلامی کی چوری یا آپی آپ ڈھک کر ہاتھوں سے گر گئی۔ جب ایک نگ اور بڑھنے کا خوف ذرا کم ہوا تو میرا باپ نجم دھا بین گیا۔ مان کو تسلی دیتا کہ اولاد تو رحمت ہے کون جانے اسی بچے کے نصیب رزق کا دروازہ کھول دیں۔ ببلی توک! ایک نگ اور بڑھ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ باپ کی ہربات سے مان کی تسلی ہو جایا کرتی تھی۔

یہ ایک حادثہ ہوا کہ جس روز میں پیدا ہوا اسی روز ہمارے گھر سے ایک نگ آپی آپ ختم ہو گی۔ جب دو موریہ اپنی کی طرف سے نوڈنی کی اواز آئی اور میری بڑی بہن نے مجھے چسی میں پیٹ کر میری مان کے پہلو میں ڈالا۔ اسی وقت میری مان نے مجھ سے منہ پھر کر کھانتے ہوئے بیٹی کو ٹوٹا۔ پھر زندگی اور پیشی دونوں پر اسی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

شاید اصلی وجہ یہی تھی کہ میرے باپ کو میری مان سے بخت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ شخچنے کے کذہ داری کے باعث اسے کام پر جانے کی تکلیف ہوتی ہو۔ وہ بجلنے کیا تھی لیکن اتنا امروز دھا کہ میرے باپ کو مجھ سے خصوصی نظرت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ صرف اتنی سی بات تھی کہ گھر میں نہ نہ کیلئے کوئی بائست مورت موجود نہ تھی۔ ہر فعل کے پیچے جو نیت ہوتی ہے اسی کا تجزو یہ اتنا اسماں بھی نہیں ہوتا۔ کئی بار یہ نیت خود فعل کرنے والے پر بھی آشکار نہیں ہوتی۔ وجہ بوجھی تھی۔ ایک بات واضح تھی کہ میرا وجود مطلوب نہ تھا میں اس مہمان کی طرح دلہیز پر کھڑا تھا جو اتفاقاً آٹکلے اور گھر میں پارٹی ہو رہی ہو۔ میں اس بھوکی مانند پھر دل کی طرح گھونگھٹ کاٹھے کھڑا تھا جو دلما گھر والوں کی نازدیک میں کے بار بجود بیا ہا۔ جس طرح کپڑے کے تھان پر گزگز کے بعد مُہر ہوتا ہے اسی طرح میرے وجود کے ہر گز پر نامطلوب نامطلوب لکھا تھا۔

مجھ نامطلوب بچے کو زبردستی ابا نے خالہ کی گود میں دے دیا۔ ہر سال پہنچنے والی گتیکے

پچھے جس طرح بیدر دی سے بانٹ دیئے جلتے ہیں اسی طرح ذرستی بڑی چاکر لگتی سے باہنے خالو کو
شیشے میں آتا رہا اور مجھے ان کا لے پا کر بنا دیا۔ . . . ایسا مستند جس کے فاؤنڈیشن سفر ہوتے
ہیں یہ احساس ساری عمر میرے تعاقب میں دہار گز گز پر لگی ہوئی اپنی امر میں نے ہمیشہ پیشی نظر
رکھی ہے۔ جبکہ مجھے لوگ کہیں اتحوں ہافتھیتے ہیں، میرے اندر وہی نامطلوب مرکا پکار ملک بکھونے
لگتا ہے۔

اس وقت بھی میرے سامنے نظر وہ کام جو ہے۔

تالیاں تڑا تڑا ہال میں گوئے رہی ہیں۔

آٹو گراف کا چینہ نیری میزو پر اوپنایا ہوتا جا رہا ہے۔ کئی مشاق اسوقت وہ ماپک لشکل دے
رہے ہیں جو اگر انہیں مجھ سے بات کرنے کا موقع مل گیا تو مجھ سے کمیں گے تو شدید، عورتیں کے
حقوق امن اہب کی احیمت، افظیر پاکستان کی تزدید یا تو ضعف، پکڑ اڑکی رنگارنگی، بدلتے ہوئے
معاشرے کی الجھنیں، پاکستانی فلموں کی یک رنگی اور بیضا بیکیتیوں کی گواہوں صحت مندی، بیرونی
ماکس سے آپنوا لے ابلاجی عاک کے دوسائی، ٹھاپٹا خ جیسی امریکن فلموں کا افادی یا اسفرت رسال اثر،
جس اور محبت کی حدود دار نہ سلے، بیرونی ماکس کی تعلیم، اپنے ملک کی، میزو زگاری — ان گنت
چانوں ماپک جن پر ہر پڑھا کھا آئی سوچتے ہے اور اپنی تربیت تعلیم اور اپنی نظر کے مطابق البتا الدھندا
ہوتا ہے، ان لوگوں کے ذہنوں میں گھوما رہے ہیں۔ میرے نزدیک ہر آدمی کا BOILING POINT
ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی ڈگری پر جا کر وہ مجہد ہوتا ہے یہ بھی ہر انسان کی منفرد کیفیت ہے اس کا
شبہی نہ کہ اس کے سکڑنے اور پھیننے کے اصول بھی مرف اسی پر لاگم ہوتے ہیں۔ جس طرح ہم فرنکس
کے اصولوں کے تحت ہماں اوسے کے خواص معلوم کر لیتے ہیں اسی طرح ممکن نہیں کہ ہم کوئی بندھا چکا انہوں
ایسا بھی مرتب کر لیں کہ ہر آدمی کا نقطہ انجاد یا اس کی وسعت کے نفحی کوئی سیٹ ٹیکسٹ ٹیکسٹ قائم کر لیں۔
لوگ مجھ سے بات کرنے کی آرزو میں سیٹوں پر کچھا لگے کو جھک آئئے ہیں۔ کرانے کے دو فون پر بیٹھی
کو لوں اور میر پر سے معطر رکیاں دل ہی دل میں مجھ سے بکلا ہکا فرش کر رہی ہیں اور مجھے مکمل

طور پر فرشی را کرنے کے منشو بے بنارہی ہیں۔
اس وقت اس ساری توجہ کا تو کس پوائنٹ میں ہوں۔

اس کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس چڑیا کے گھونڈکی طرح نامطلوب ہوں جو دن ماں
طور پر چھٹ کے ساتھ لٹکہ ہوئے پنچ کے پیڈے میں بنا لیا کر قبیلے ہے لیکن جس میں اس کا گھنٹہ نہیں تھا۔
یہ لوگ داصل میرے اس جماعتی وجود کے اندر کسی اور مقدار مہربانی تباہی احریم شخصیت کا سوت
کر رہے ہیں۔ یہ اس آدمی کو نہیں دیکھ سکتے جو اس قسمی سوت کے اندر چپا بیٹھا ہے۔ میں اس دیا
کی نکڑی کی مانند ہوں جسیں پریلیک کہ نکڑی لگا کر دنیا کر دیا گیا ہو۔ ساری زندگی مجھے شدت سے
اسی رہا کہ میں کسی انسان، کسی مش، کسی خاص جگہ، مقام یا موقع کبdest میں نہیں ہوں۔ لیکن
اس احساس کے باوجود میری تقریر کے دوسرے صفحے پر لکھا تھا:

معزز خواتین و حضرات:

دراصل ہر انسان اس دنیا میں کسی خاصی سیکھ کی طے شدہ پلان کے تحت دعوییں آتا ہے،
چاہے بنا ہر وہ کتفی ہی بے لفاضت زندگی کیوں نہ بصر کرے اس کی زندگی ہمیشہ کار آمد ہوتی ہے
پاںکل ان کیلیوں کی طرح جو بندھا مرزاوری نہیں ہوتے لیکن فرنیچر کو معتبر طبقہ بنانے کے لئے شرکت کے جانتے
ہیں۔ (تایاں)

جب آپ کابوئی کی حدود سے باہر نکلیں گے تو پہلی بار زندگی آپ سے ہاتھ لانے آئے گی۔
ہو سکتا ہے کہ اس نے باکنگ کے درستنے بھی پنر رکھے ہوں اور آپ کا لکھہ بہت نازک ہو۔ کابوئی
کی زندگی میں ایک نقص فزور ہے۔ یہ انسان میں قالین کے شیر جیسی دلیری پیدا کر قبیلے کی گئیں
کے جاثیم بھی سادوں کے اندر ہے کی طرح ایک ہی محنت میں دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہاں سے تعلیم
آپ نے اساتذہ میں سے حاصل کی جو کچھ آپ نے ہاتھ دخیلات سے اپنایا۔ جو موئی آپنے کتابوں سے
چُنچُن کر کشمکش کرے۔ لیکن ہے اسی سب کیلئے کوئی جو ہری بر وقت ہمیاں ہو سکے اور آپ محسوس کریں کہ
زندگی نے دراصل آپ سے دنابازی کی۔ جب آپ باہر نکلیں گے تو ہو سکتا ہے کہ ہمیشہ آپ کا چکنا

نہ پڑے۔ ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں توبہ کے پتے نہ آئیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تعلیم نے جو کچھ آپ کو
و ولیعت کیا زندگی علی طور پر اس تعلیم کی نفع کے اہاب پیدا کرنے رہے لیکن میں آپ لوگوں سے
دست بابت عرض کروں گا کہ جو ادنیٰ ناکامیابی کی دستک پر احساسی مکتری کا شکار ہو جانا ہے وہ اپنے
مشن میں فیل نہیں ہوتا۔ وہ داخل اللہ کی حکیم اور اس کے پلان کی نفع کرتا ہے۔ یونکہ ناکامیابی بمحض
در اصل کامیابی کا ہی دوسرا روپ ہے۔ جو کیں بخاہ غیر مزودی نظر آتی ہے عموماً ہی مضبوطی کا باعث
بھی بنتا ہے ۰۰۰۰۰۔

یہاں لکھاں پھر بڑی گرموجشی اور تواتر سے کچھنا تجربہ کار فوجیان تائیاں بدلتے ہیں۔

اس کے بعد میں بڑے تسلیم کے ساتھ بابر ادشاہ کی وہ کمانی بیان کرتا ہوں جو میں نے اور
کی پانچویں جماعت میں پڑھی تھی اور جس میں بابر بادشاہ نے فرغانہ پر حملہ کرنے سے پہلے ہمت کا سبق
بے چاری خنی چھوٹی سے سیکھا تھا جو حوض کے کنارے بار بار پڑھتی تھی اور بار بار گرفتی تھی.....
وہ اس کمانی سے بخوبی دافت ہیں۔ کوئی اسے صلاح الدین ایوبی سے، کوئی رابرٹ برڈس سے
منسوب کرنے کا عادی ہے پرانی انفرمیشن کا اگر اعادہ کیا جائے تو عموماً دلچسپی کا موجب ہوتا ہے۔
اہم نئے اسی وقت لوگوں کی آنکھوں میں خوشی کی چک ہے گوچھوٹی سے جو سب میں نے اصل
میں سیکھا ہے وہ بابر بادشاہ سے بہت مختلف ہے۔

میں جانتا ہوں جن کھشے انگوروں کیلئے انسان بہت دیراچھتا سبے اور بالغرض وہ اپنی کوشش
سے باقحوں میں آبھی رہی تو وہ کبھی میشے نہیں ہو پات۔

میری تعلیم کی منزلیں میری لگا ہوں کے سامنے گھوم رہی ہیں۔

میں چھوٹی کی طرح بار بار حوض میں نہیں گلا بکھہ بڑی تواتر سے پاس ہوتا ہم۔ ٹرم پرڈم اکائی
درکھانہ سال بہ سال اور پڑھتارا۔ لیکن اس کامیابی کے باوجود میری کیفیت ہمیشہ ایک رہی کہ تم
حرب میں کا بڑھ سکتے ہے فتح انگلینڈ کو ہوتی ہے۔ کامیابی سے جس خوش اعتمادی کو جنم لینا چاہئے اس کامیابی
نے کبھی میرے دروانے سے پر دستک نہ دی۔ خدا جانے کیا وجہ تھی؟

میری خالہ ہر وقت اللہ رکل سے ڈلتی تھیں اسکے کبھی کسی نہ انہیں سنگے صرخہ دیکھا۔
انہیں جب کبھی بہت پیاس آتا ہے اپنے بچوں کو بچھتے بغیر ان کے اتنے چمیا کرتی تھیں میرے لئے
ایسے فردی عجیب چدیات بھی خارجہ از فرست تھے۔

میں جب بھی سالانہ امتحان میں پاس ہو کر گھر آیا یا کوئی ٹرانی یا سکالر شپ کا حمدہ رکھ رہا تھا
اور محترمین ہمیشہ کچھ ایسی گفتگو ہوتی۔

”رزک نکل آیا؟“

”بھی.....“

”پاس ہو گئے؟“

”بھی.....“

”مبارک ہو۔ آپاکی روح آج کتنی خوش ہو گی۔“

میں اسکا پاکی روح کو خوش کرتا رہا اور پاس ہوتا گیا۔ لیکن پڑھنیں اتنی ساری کامیابی نے مجھے بیکھری
ہوئی روئی کی طرح بوجھن ہونے کا احساس کیوں دلایا؟ — خالہ نے مجھے کسی برا سلوک نہ کیا۔
اس کھرمنگ قوازن، اعتدال، تناسب اسی قدر تھا کہ ساری زندگی گھر بھر کی سو یوں کی طرح میکھر
میکھ چلتی تھی۔ ہر حصہ بقدر ضرورت نہیں بقدر بُجھتہ تازدہ میں تسلی کرتا تھا، رُطائی جھکڑے میں جدایا
بچھا جھوپیتا۔ پیارہ محبت میں عزت نفس بند باندھ دیتی۔ زندگانی کی ہائل کی طرح ہمیشہ متوازنی
انہوں میں چلتی تھی اور انت پر جا کر بھی اس میں کسی قسم کے ٹھپ کے امکانات نہ تھے۔

یہ نہیں کہ خالہ مذہبی حدود تھی بلکہ نہیں تو پیاس تک کوں گا کہ نماز زدنے کی پابندی بھی
وہاں عجیب قسم کی تھندی تھندی رہیں ہیچی تھا را ٹھر جیسے تھرمی میں لگا رہتا۔ ایک سی حرارت —
ایک سی غلکی — ایک سی بیکاری!

خالہ نے مجھے کبھی نہیں جوڑا کا۔

خالہ کے بچوں نے مجھے کبھی کوئی زیادتی نہیں کی۔